مکمل تعلیمی انقلاب کی منفرد آواز

از جناب نعیم صدیقی صاحب

کسی قوم کی حقیقی آزادی کا نقطۂ آغاز دراصل باہر کے مسلط کردہ نظریات و تصورات کے سلاسل و اغلال سے اُس کے ایمان و فکر کا آزاد ہونا ہے۔ بیرونی سیاسی استیلاء کے خاتمے اور کسی سامراجی طاقت سے نجات پا لینے سے تو محض اس امر کا موقع پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کی سمت میں گامزن ہونے والی قوم خارجی مداخلت کے اندیشے سے فارغ ہو کر اپنے جہانِ افکار کو تعمیر کر سکے، اپنے قومی تشخص کو اُس کے مخصوص تہذیبی خدوخال کے ساتھ تاریخی حوادث کے اُس ملبے سے نکال کر اور گرد و غبار سے پاک کر کے ازسرِنو استوار کر سکے جس کے تودے کے تودے سامراجی یلغار کے نتیجے میں معاشرے کے ہر گوشے میں نمودار ہو جایا کرتے ہیں۔ مگر ہم لوگ جنہیں اللہ کے فضل و کرم سے برطانوی شہنشاہیت اور اس کے سلیبے میں پل پوس کر ہمیں دبوچ لینے کی تیاری کرنے والے برہمنی مہاجنی سامراج سے نجات پائے آج ۲۹ سال پورے ہونے کو ہیں، اب تک ہمارے معاشرے کے افق سے ایمان و فکر کا خورشیدِ زندگی افروز طلوع نہیں ہوا۔ ابھی ہم حقیقی آزادی کے اس نقطۂ آغاز تک پہنچنے کے لیے نت نئے راہزنوں کا دامن تھام کر خوف اور محرومیوں کی وادی میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔

ہماری ۲۹ سالہ داستانِ آزادی کتنی دُکھ بھری ہے! اس مدّت میں ہمارے سروں سے کبھی خون کی موجیں گزر گئیں اور کبھی آگ کی لہریں۔ یہاں تک کہ ہمارا نوتشکیل یافتہ وطن دو لخت ہو کر رہ گیا۔

تعمیرِ معاشرہ میں تعلیم کی اہمیت

دراصل ایمان و فکر کو کسی بھی نقشے پر نشوونما دینے میں کسی قوم کے نظامِ تعلیم کو بہت ہی موثر دخل حاصل ہوتا ہے۔ نظامِ تعلیم ہی نئی نسلوں کو کسی بلند نصب العین کی طرف پرواز کرنے کے لیے فکر و حکمت کے بال و پر دیتا ہے۔ مگر ہماری مصیبت یہ ہوئی کہ ہم آزادی کے ۲۹ سال گزار کر بھی

رخصت ہو جانے والی سامراجی قوت کے بنائے ہوئے اس تعلیمی قفس میں گرفتار ہیں جس کی شان ہی یہ رہی ہے کہ نہ وہ بال و پر اُگنے دیتا ہے اور نہ ذوقِ پرواز ہی سے اپنے پروردگان کو بہرہ مند ہونے دیتا ہے۔ یہ قفسِ تعلیم نہ جانے کیوں ایک ایسی مقدس میراث قرار پا گیا ہے کہ اس میں اب تک معمولی قسم کے ردّ و بدل سے آگے بڑھ کر کسی حکمراں قوت نے یہ سوچنے تک کی جرأت نہیں کی کہ اس قفس کو توڑ کر ملت کا اپنا ایک آزاد نشیمن وجود میں لایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہم تعلیمی غلامی سے نجات پانے کے قابل نہیں ہو سکے۔

قومی زندگی میں نظامِ تعلیم کی وہی حیثیت ہے جو فرد کے لیے اس کے دماغ کی ہوتی ہے۔ اگر دماغ کسی ساحر کی ساحری اور کسی سامری کے طلسم کا شکار ہو جائے تو فرد کی ساری حرکات و سکنات اسی کے منشاء کے مطابق نمودار ہوں گی، خواہ وہ اپنی جگہ یہ سمجھتا رہے کہ وہ اپنی آزاد سوچ سے ہر اقدام کر رہا ہے۔ اگر اس کے اپنے دینی اور ملی اور خاندانی رجحانات کے خلاف متضاد قسم کے تہذیبی افکار و تصورات اس کے دماغ میں فاتحانہ شان سے گھس کر مستقل محاذ آرائی کی کیفیت پیدا کر دیں تو اس کے عقیدے اور افکار ہر لمحہ ایک ایسی جنگِ مسلسل سے دوچار رہیں گے جس میں روز اس کے اصول و روایات میں سے کچھ موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں اور کچھ زخمی اور اپاہج ہو کے رہ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں پراگندگیٔ افکار اور ذہنی انتشار کے روگ سے کوئی بچاؤ نہیں۔ ایسے ہی تضادات کے غیر مختتم تصادم کی وجہ سے بسا اوقات دماغ بالکل ہی چل جاتا ہے اور پھر جسم و اعضا کی تمام حرکات لایعنی بلکہ تخریبی ہو کے رہ جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اگر ایک قوم کا نظامِ تعلیم فساد و اختلال کی کسی بھی خاص صورت کا شکار ہو جائے تو اس قوم کی تمام سیاسی، معاشی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بگاڑ اور ضرر پیدا ہو جاتا ہے۔

نظامِ تعلیم جو مسلط ہے

بدقسمتی سے ہم جس نظامِ تعلیم سے دوچار ہیں وہ ہمارے قومی وجود اور تہذیبی تشخص سے غیر ہم آہنگ اور ہر لحظہ برسرِ تصادم ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے کے کسی بھی شعبے کی کل سیدھی نہیں اور جو پہلے کچھ سیدھی تھی بھی، وہ بھی روز بروز ٹیڑھی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن کارفرما قوتوں نے کبھی تعلیم کے بنیادی نقطے پر صحیح طور پر توجہ ہی نہیں دی۔

ہماری متذکرہ بنیادی قومی کوتاہی کے نتائجِ بد کی فصل ہمارے چاروں طرف لہلہا رہی ہے۔ ذہنی بانجھ پن، لامقصدیت، جعل سازی، خیانت، ضمیر فروشی، ناشائستگی، قانون شکنی، بے ضابطگی، ہوس پرستی اور فحش پسندی کے روگ کتنے عام ہیں۔ اخلاقی کوڑھ میں اضافہ کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہر شخص کام کے بغیر

یا قلیل وقت میں کم کام کر کے جلد سے جلد بہت کچھ حاصل کر لینے کے در پے ہے۔ انفرادی اور قومی آمدنیوں کی افزائش سے پہلے معیار زندگی کو اونچا کرتے جانے کا ماحصل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ جائے۔ حد یہ ہے کہ لوگ قوم کو بے وقوف بنا کر اور قومی مفاد کو بیچ کر ذاتی زندگی کی جنتیں آراستہ کرتے ہیں۔ یہ خرابی احوال تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس وجہ سے اس کی زیادہ تر ذمہ داری نظامِ تعلیم پر جاتی ہے۔ راقم کا مدعا یہ ہے کہ مسئلہ تعلیم کسی قوم کا بے حد اہم اور بالکل اہم مسئلہ ہے اور اس پر توجہ نہ دی جائے تو سارا معاشرہ چوپٹ ہو کے رہ جاتا ہے۔

مولانا مودودی کے تعلیمی افکار پر تحقیقی کام

ہماری تاریخ میں اپنے وقت کے حالات کو ملحوظ رکھ کر سرسید ایک تعلیمی اسکیم لے کر اٹھے تھے، لیکن اس اسکیم کا جو وقتی مقصد تھا وہ اپنے اچھے اور برے پہلوؤں کے ساتھ حاصل ہو چکا، اور اب دورِ آزادی میں ایک آزاد مسلم ریاست کے لیے وہ اسکیم ذرہ بھر کارآمد نہیں رہی۔ اس برصغیر میں آزادی ملنے سے کچھ عرصہ پہلے صحیح اسلامی زاویۂ نگاہ سے پہلی بار ایک مکمل تعلیمی انقلاب کی آواز اٹھی۔ یہ مولانا مودودی کی آواز تھی۔ صرف آواز ہی نہیں اٹھی، بلکہ آہستہ آہستہ مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ایک جامع حکمتِ تعلیم، اس پر عمل پیرا ہونے کی اسکیم اور اس کے لیے نصابیات وغیرہ مسائل پر اتنا مواد ہمارے سامنے رکھ دیا کہ اگر مولانا مودودی اور کوئی کام نہ کرتے تو یہی ایک کارنامہ انھیں ہماری تاریخ کی ایک عظیم شخصیت بنانے کے لیے کافی تھا۔

مولینا مودودی ماضی سے لے کر حال تک پھیلی ہوئی اس صفِ رجال میں سے ہیں جس کے ہر فرد کا سانحہ یہ ہے کہ اس کے سرچشمۂ علم سے استفادہ کرنے والے مخلصین کے مقابلے میں اس پر کیچڑ پھینکنے والوں کا انبوہ ہمیشہ کثیر التعداد رہا ہے۔ دراصل زمانہ ہر اس شخص سے انتقام لیتا ہے جو اس کے دھارے کا رخ بدلنے کی سعی کرے۔ مولینا مودودی نے یہ انقلابی سعی نہ صرف تعلیم کے دائرے میں کی بلکہ دینی شعور و حکمت کے دائرے میں، سیاست و اقتصادیات کے دائرے میں، معاشرت و ثقافت کے دائرے میں اور دستور و قانون کے دائرے میں بھی پُرزور طریق سے جاری رکھی۔ اتنے بڑے جرم کی کچھ تو پاداش ہونی چاہیے تھی۔ مگر معاندین و حاسدین کے اٹھائے ہوئے طوفانوں کے درمیان قوم کے کچھ ذہین عناصر آہستہ آہستہ مولانا مودودی کے پیغام کے خدوخال کو پہچاننے لگے اور ان کے افکار سے استفادہ کرنے والوں

کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔[۵]

سب سے پہلے ہمیں گذشتہ پچاس سال سے نشوونما پاتی ہوئی تاریخ | ہر نظامِ تعلیم کسی تہذیب کا خادم ہوتا ہے!

کی وسعتوں میں تعلیمی انقلاب کے داعی کی حیثیت کو مشخص کر لینا چاہیے۔ اس طرح ان کے افکار و اصطلاحات کو سمجھنا سہل تر ہو جائے گا۔

اصل میں مولینا مودودی مسلمانوں کے خلاف مغرب کی ملحدانہ و نفس پرستانہ تہذیب کی بڑھتی ہوئی فتوحات کے دور میں اٹھے، اور انہوں نے اس انسانیت کش اور اسلام دشمن تہذیب کی مزاحمت کا مجاہدانہ عزم باندھا اور کچلی پسی ہوئی مسلمان قوم کے اندر سے بیدار دل، زندہ ضمیر اور محکم ایمان افراد کی بچی کھچی تعداد کو اپنی دردمندانہ پکار سے اٹھا کر ایک محاذ پر لا کھڑا کیا۔

کوئی شخص جو اپنی تہذیب کے احیاء اور بیرونی تہذیب کی مزاحمت کے لیے اُٹھا ہو، وہ اگر نظامِ تعلیم کے مسئلے سے تعرض نہ کرے تو اس کا شعور کیسے قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مولانا نے جہاں اعتقادی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی موضوعات کو نئے انداز سے چھیڑا، وہاں انہوں نے مروجہ نظامِ تعلیم کو اپنی شدید تنقید کا ہدف بنایا اور اسلامی حکمتِ تعلیم کے خطوط اچھی طرح اجاگر کیے۔ اس سلسلے میں بنیادی کام تو حصولِ آزادی اور تشکیلِ پاکستان سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ مگر پاکستان چونکہ بھاری مسلم اکثریت

۵؎ اسی سلسلہ کی کڑی پنجاب یونیورسٹی کے ادارۂ تعلیم و تحقیق کی نگرانی میں اسی ادارے کے فارغ التحصیل نوجوان جناب پروفیسر محمد حسین صاحب کا وہ تحقیقی مقالہ بھی ہے جس کے لیے یہ افتتاحی سطور لکھنے کا شرف انہوں نے بہ اصرار مجھے دیا ہے۔

محمد حسین صاحب کی یہ خدمت ایک تو اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ پنجاب کے مشہور مرکزی تعلیمی ادارے کے تحت تعلیم ہی کے موضوع پر مولینا مودودی کے خیالات کو تحقیق و ترتیب کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے۔ دوسرے یہ اس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے اور تعلیم کے مضمون (SUBJECT) کے اساتذہ و طلبہ کے لیے انہوں نے اسلامی حکمتِ تعلیم پر ایک ایسا مقالہ تیار کر دیا ہے جو ایک طرف تعلیمی انقلاب کی رُوح اپنے اندر لیے ہوئے ہے، اور دوسری طرف وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ موجودہ حالات میں (خصوصاً پاکستان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے) مجوزہ تعلیمی انقلاب کس طرح روبعمل آنا چاہیے۔

کی مملکت بنا اور اس کو اسلام کے نام پر استوار کیا گیا، اس وجہ سے تعلیم کی بحث کو مولینا مودودی نے اور بھی زور سے آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ اب اسلامی نظامِ تعلیم کا مکمل تصور ان کے آئینۂ افکار میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

متذکرہ سطور کی تائید میں میں مولینا مودودی کے چند الفاظ یہاں درج کر رہا ہوں جن سے صاف عیاں ہے کہ مسئلہ تعلیم کو مولینا تہذیبی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں:۔

"ہر یونیورسٹی کسی کلچر (مولینا نے یہ لفظ بصیغۂ مونث ہی استعمال کیا ہے۔صدیقی) کی خادم ہوتی ہے۔ ایسی مجرد تعلیم جو ہر رنگ اور ہر صورت سے خالی ہو، نہ آج تک دنیا کی کسی درسگاہ میں دی گئی ہے نہ آج دی جا رہی ہے۔ ہر درسگاہ کی تعلیم ایک خاص رنگ اور ایک خاص صورت میں ہوتی ہے اور اس رنگ وصورت کا انتخاب پورے غور و فکر کے بعد اس مخصوص کلچر کی مناسبت سے کیا جاتا ہے جس کی خدمت وہ کرنا چاہتی ہے"[1]

اس موضوع پر میرا مطالعہ اگر قابلِ اعتماد حد تک جامع ہوتا تو میں حتمی طور پر دعویٰ کرتا کہ تعلیم کو ہمارے یہاں مولینا سے پہلے کسی شخص نے اس واضح سائنٹفک نظریے سے نہیں دیکھا اور تعلیم اور تہذیب (یا کلچر) کے ربطِ باہم کو یوں نمایاں نہیں کیا۔ کچھ اقتباس اور:۔

"ترقی علم وتمدن کے موجبِ فلاح یا موجبِ ہلاکت ہونے کا تمام تر انحصار اُس تہذیب پر ہے جس کے زیرِ اثر علوم وفنون اور تمدن وحضارت کا ارتقاء ہوتا ہے۔ ارتقاء کا راستہ، انسانی مساعی کا مقصد اور حاصل شدہ قوتوں کا مصرف متعین کرنے والی چیز دراصل تہذیب ہے"[2]

"حقیقت میں تعلیم کا مسئلہ ایک مملکت کے بنیادی مسائل میں سے ہے .... اس کے سربراہ کاروں کو سب سے پہلے اس کی فکر ہونی چاہیے تھی"[3]

"اب اگر ہم اپنی ایک کلچر رکھتے ہیں، ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کے اپنے کچھ عقائد ہیں، جس کا اپنا

---

[1] تنقیحات ساتواں ایڈیشن صفحہ ۳۲۴

[2] " " " صفحہ ۹۳

[3] تعلیمات، تیسرا ایڈیشن صفحہ ۲۴

ایک نظریۂ زندگی ہے جس کا اپنا ایک نصب العین ہے، جو اپنی زندگی کے کچھ اصول رکھتی ہے تو لازماً ہمیں اپنی نسلوں کو اِس غرض کے لیے تیار کرنا چاہیے کہ وہ ہماری اس کلچر کو نہ صرف یہ کہ زندہ رکھیں بلکہ آگے انہی بنیادوں پر اُسے ترقی دیں جس پر ہماری یہ کلچر قائم ہے ـــــ مجھے کوئی قوم ایسی معلوم نہیں جس نے اپنا نظامِ تعلیم خالص معروضی بنیادوں پر قائم کیا ہو اور اپنی نسلوں کو بے رنگ تعلیم دینے کی کوشش کی ہو۔ اسی طرح مجھے ایسی بھی کوئی قوم معلوم نہیں ہے جو دوسروں سے ان کا نظامِ تعلیم جوں کا توں لے لیتی ہو اور اپنی تہذیب کا کوئی رنگ اس میں شامل کیے بغیر اسی سانچے میں اپنی نئی نسلوں کو ڈھالتی چلی جاتی ہو۔"[۱]

مولانا مودودی نے تعلیمات[۲] میں وہ چار وجوہ بیان کیے ہیں جن کی بنا پر موصوف "انقلابِ تعلیم" کو لازم گردانتے ہیں۔ یہاں ہم وجوہ درج نہیں کر رہے، بس واضح یہ کرنا مقصود ہے کہ انقلابِ تعلیم کی اصطلاح بھی خود موصوف کی وضع کردہ ہے اور ان کے تعلیمی افکار میں اس اصطلاح کا مفہوم مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔

تعلیمی نظام میں اسلام اور سائنس کا تعلق | نہایت اہم گفتگو وہ ہے جو مولینا نے نظامِ تعلیم کی بحث میں اسلام اور سائنس کے باہمی تعلق کے بارے میں کی ہے۔ اس سے تعلیمی انقلاب کا وہ تصور اجاگر ہو جاتا ہے جس کے علمبردار مولینا مودودی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"بہت سے لوگ اس خیال کو سن کر بڑے پریشان ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سائنس کا آخر اسلام سے کیا تعلق، حالانکہ ان کے سامنے روس کی مثال موجود ہے جو سوویٹ سائنس کا قائل ہے۔ کوئی کمیونسٹ اپنے اشتراکی معاشرے کے افراد کو بورژوا سائنس اور بورژوا فلسفہ و تاریخ اور معاشیات و سیاسیات وغیرہ پڑھانا پسند نہیں کرتا۔ وہ ان سب علوم کو مارکسزم کے رنگ میں رنگ کر پڑھاتا ہے تاکہ اشتراکی سائنس دان اور اشتراکی ماہر علوم پیدا ہوں۔ بورژوا نقطۂ نظر سے مرتب کیے ہوئے علوم کو پڑھا کر کوئی اشتراکی معاشرہ نہیں بن سکتا۔"

---

۱ تعلیمات، تیسرا ایڈیشن صفحہ ۱۴۲۔

۲ " " صفحہ ۸۱، ۸۲۔

"یہ کہنا کہ سائنس تو ایک عالمگیر چیز ہے، اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں، فی الواقع بڑی ناسمجھی کی بات ہے۔ سائنس میں ایک چیز تو ہیں حقائق (FACTS) اور قوانینِ فطرت (NATURAL LAWS) جو تجربے اور مشاہدے سے انسان کے علم میں آتے ہیں۔ یہ بلاشبہ عالمگیر ہیں۔ دوسری چیز ہے وہ ذہن جو ان حقائق اور معلومات کو مرتب کر کے ان پر نظریات قائم کرتا ہے اور وہ زبان جس میں وہ ان کو بیان کرتا ہے۔ یہ چیز عالمگیر نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ہر تہذیب کے پیروؤں کا اسلوب الگ الگ ہے اور فطرتاً الگ ہونا چاہیے۔ ہم اس دوسری چیز کو بدلنا چاہتے ہیں نہ کہ پہلی چیز کو۔"[1]

سائنس کے دائرے میں تجربات و مشاہداتِ حواس کے ساتھ مفروضاتِ قیاس مل کر کام کرتے ہیں۔ سائنس کے ایک ایک ذرۂ حقیقت کے گرد بالعموم پورا ایک جہانِ مفروضات تعمیر ہو جاتا ہے اور اصطلاحِ عام میں یہ سب کچھ سائنس کہلاتا ہے۔ مولانا نے ایک مثال دے کر مدعا کو واضح تر کر دیا ہے:

"مثال کے طور پر دیکھیے۔ یہ ایک سائنٹفک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام دوسری چیزیں تو سرد ہو کر سکڑتی چلی جاتی ہیں مگر اس کے برعکس پانی جب سرد ہوتے ہوتے جمنے کے قریب پہنچتا ہے تو پھیل جاتا ہے اور برف بن کر ہلکا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے برف سطحِ آب پر تیرنے لگتی ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے۔ اب ایک شخص اس چیز کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ یہ پانی کی خاصیت ہے اور واقعتاً ایسا ہوا کرتا ہے۔ دوسرا شخص اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ خدا نے اپنی حکمت و ربوبیت سے پانی میں یہ خصوصیت اس لیے رکھی ہے کہ دریاؤں اور تالابوں اور سمندروں میں جاندار مخلوق باقی رہ سکے! دیکھیے ایک ہی امرِ واقعہ کو دو شخص اپنے اپنے طرزِ فکر کے مطابق دو مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور ہر ایک کا بیان پڑھنے سے آدمی کے ذہن پر دو مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں ....

...... ایک طریقے سے اگر سائنس کو پڑھایا جائے تو اس سے ایک مادہ پرست سائنسدان تیار ہو گا اور دوسرے طریقے سے وہی سائنس پڑھایا جائے (نوٹ مولانا کی عبارت میں یہاں لفظ سائنس مذکر ہی استعمال ہوا ہے۔ صدیقی) تو ایک مسلمان سائنسدان تیار ہو جائے گا۔"[2]

---

[1] تعلیمات ص ۲۳۸، ۲۳۹۔

[2] ایضاً ص ۲۳۹ - ۲۴۱۔

موجودہ سائنس اور اسلامی نقطۂ نظر | مروجہ سائنس جن بنیادی تصورات پر کھڑی ہے ان میں اس سے زیادہ غیر عقلی تصور شاید ہی کوئی ہو کہ سائنس جہانِ مادی کے ایک ایک ذرے پر "قانون" کی کارفرمائی کا دعویٰ کرتی ہے، لیکن اتنے وسیع و بے پایاں عقلی قانونی نظام کے بارے میں وہ یہ رائے رکھتی ہے کہ اس سارے عقلی نظامِ قانون نے غیر عقلی "اتفاق" سے جنم لیا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جہاں قانون ہے وہاں تمہیں کسی حکیم و علیم قانون ساز کے وجود کو ماننا ہوگا اور قانون کے صحیح طور پر مسلسل چلتے رہنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قانون کو چلانے کے لیے قانون ساز قوت کے ساتھ اقتدار بھی رکھتا ہے۔ لیکن مادہ پرستوں کی مرتب کردہ سائنس کی اتنی بڑی عقلی حماقت کو نظامِ تعلیم کے واسطے سے ہم مسلمانوں نے بلاکسی ردوکد کے قبول کر لیا ہے۔ فی الحقیقت سائنس نام ہے ان مساعی کا جن کے ذریعے ہم خدا کے جاری کردہ طبعی، تکوینی، جسمانی، حیوانی، نفسیاتی اور تاریخی قوانین کو دریافت کرتے ہیں۔

تعلیمی انقلاب کے داعی نے سائنس کی تعلیم کے بارے میں کلمۂ تکمیل کے طور پر کہا ہے کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو انسانوں کے دل میں ایمان کو گہری جڑوں سے راسخ کر دینے والا نہ ہو۔ فزکس، بیالوجی، فزیالوجی، اناٹومی، اسٹرانومی، غرض جس علم کو بھی آپ دیکھیں اُس میں ایسے ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جو انسان کو پکا اور سچا مومن بنا دینے کے لیے کافی ہیں ـــــ یہی تو وہ آیات الٰہی ہیں جن کی طرف قرآن بار بار توجہ دلاتا ہے۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ کافر سائنس دانوں نے ان حقائق کو اپنے نقطۂ نظر سے مرتب اور بیان کیا ہے، اِن کو پڑھ کر آدمی اُلٹا مادہ پرست اور ملحد بنتا ہے اور خدا کے تصور پر ہنستا ہے اور اس کا مذاق اُڑاتا ہے ـــــ ہم بے خدا سائنس اور بے خدا فلسفہ اور بے خدا اجتماعی علوم پڑھا کر خدا پرست انسان تیار نہیں کر سکتے۔"[۱]

زیر تحقیق انقلابی نظریۂ تعلیم اسلامی فکر کو پورے مضامین و نصابات پر جس طرح غالب و مسلط کر دینا چاہتا ہے اس کا اندازہ سائنس کے متعلق متذکرہ اقتباسات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

نظامِ تعلیم اور مسئلہ قیادت و امامت | مولینا مودودی نے ستمبر ۱۹۳۳ء میں لکھا تھا کہ:

"دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے۔"[۲]

---

[۱] تعلیمات ص ۲۴۱۔ [۲] تنقیحات ۔ ساتواں ایڈیشن ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۔

جنوری ۱۹۴۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انجمن اتحاد طلباء کے سامنے جو خطبہ مولینا نے پڑھا، اس میں فرمایا کہ:

"امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا۔"[1]

دنیائے انسانیت کی امامت یا قیادت (LEADER SHIP) کے اسی تصور کی بنا پر اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ مرتب کرتے ہوئے مولینا نے مقصدِ تعلیم یہ قرار دیا کہ:

"وہ ایسے صالح علماء تیار کرے جو اس دورِ جدید میں ٹھیک ٹھیک دینِ حق کے مطابق دنیا کی رہنمائی کرنے کے لائق ہوں۔"[2]

اگر میں یہ کہوں تو شاید بات غلط نہ ہوگی کہ تعلیم و امامت کے اسی تعلق کی بنا پر ۱۹۴۲ء میں دارالاسلام پٹھانکوٹ کی مجلسِ تعلیمی کے سامنے موصوف نے صراحت سے کہا تھا کہ:

"اس وقت ہمارے ملک میں جتنے نظام ہائے تعلیم رائج ہیں ان میں سے کوئی بھی اُس مقصد کے لیے آدمی تیار نہیں کرتا جو ہمارے پیشِ نظر ہے ــــ ہمیں صرف یہی نہیں کرنا ہے کہ نوخیز نسلوں کی علمی اور ذہنی تربیت کا انتظام اپنے نصب العین کے مطابق کریں بلکہ اس کے ساتھ ان کی اخلاقی اور عملی تربیت کا بندوبست بھی کرنا ہے۔"[3]

یہاں بات اصل تصور سے کسی قدر محدود شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس کی وجہ بھی سن لیجیے:

"اس وقت ہم کسی ملک کے انتظام کا چارج نہیں لے رہے ہیں کہ ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں اُن ضرورتوں کے لیے آدمی تیار کرنے ہوں جو ایک ملک کے تمدن کی پوری مشینری کو چلانے میں پیش آتی ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت صرف ایک کام ہے اور وہ یہ ہے کہ دُنیا میں اخلاقی، فکری اور عمرانی انقلاب برپا کرنے کے لیے موزوں لیڈر اور کارکن تیار کریں"۔[4]

بہرحال مولینا جس انقلابی دعوت تعلیم کو لے کر اٹھے ہیں، اس کی رُو سے علم و تعلیم اور امامت و قیادت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو قوم تعلیم اور علم و تحقیق میں آگے بڑھتی ہے، وہی دوسروں کے لیے

---

[1] تعلیمات، ص ۶۸۔

[2] تعلیمات، ص ۱۶۸

[3] تعلیمات، ص ۱۰۴

[4] تعلیمات، ص ۱۰۵

پیش رو بنتی ہے اور اسی کی تقلید کی جانے لگتی ہے۔ علم اُسے اِس فکری و ذہنی استیلا اور سیاسی و اقتصادی فوقیت کا راستہ بنا کے دیتا ہے۔

اس خاص بحث کے لیے "تنقیحات" (از مولینا مودودی) کے بیشتر مضامین خصوصاً اس کے پہلے مقالے "ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب" سے بہت مفید مواد اخذ کیا جا سکتا ہے۔

نشأۃِ جدید کی ضرورت تعلیم اور امامت کے تعلق کو سامنے رکھ کر نظامِ تعلیم پر سوچنے کے لحاظ سے بھی مولینا بڑی حد تک منفرد مقام رکھتے ہیں اور پھر اس تعلق کی وضاحت بھی انہوں نے اپنی تحریروں میں بڑے زورِ بیان سے کی ہے۔

"علم برائے امامتِ عالم" کے اسی نظریے کے فریم میں تعلیم کے متعلق ان کی انقلابی فکر نصب ہوئی ہے۔ اور اسی کلیے کی روشنی میں ان کے مختصر سے اس فقرے کا مدعا سمجھ میں آسکتا ہے کہ:

"اسلام میں ایک نشأۃِ جدید (RENNISANCE) کی ضرورت ہے۔"[۱]

کیونکہ:

"پرانے اسلامی مفکرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا..... علم و عمل کے میدان میں وہی رہنمائی کر سکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے، نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہٰذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جس پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہے۔"[۲]

اتنا بڑا معرکہ ہے مولینا کے سامنے۔ وہ عالمگیر تسلط رکھنے والی مغربی تہذیب کی عمارت کی بنیادیں ڈھا دینا چاہتے ہیں اور اس کے لیے علم و تحقیق اور نظامِ تعلیم کی قوت کو بر سرِ عمل لانا چاہتے ہیں۔

مسلم تعلیم گاہوں کا ناقدانہ جائزہ مولینا مودودی کی انقلابی تعلیمی فکر کو سمجھنے میں ہمیں وہ تنقیدی تحریریں بہت مدد دیتی ہیں جو جدید اور قدیم ہر دو قسم کی قائم شدہ مسلم تعلیم گاہوں کی اسکیموں کے اساسی تصورات کا احتساب کرتی ہیں۔ کسی ڈھانچے کے اندر جامد ذہن کے لوگ تو سکون سے چلتی رو میں بہتے رہتے ہیں اور کسی ڈھانچے

[۱]، [۲] تنقیحات، ساتواں ایڈیشن ۱۹۶۳ء ص ۲۲ - ۲۳

کے اندر بعض پسندیدہ اجزا دیکھ کر راضی ہو جاتے ہیں ۔ پھر کچھ مصلحین ہوتے ہیں جو اساسیات کو چھیڑے بغیر تفصیلی مظاہر میں دو چار تبدیلیوں کے لیے کوشش کرتے ہیں ۔ لیکن انقلابی ذہن کا آدمی اساسیات اور ڈھانچے کی مجموعی حیثیت کی غلط ساخت پر گرفت کرتا ہے اور اس میں تبدیلی کی دعوت دیتا ہے ۔ جدید و قدیم دونوں قسم کی مسلم تعلیم گاہوں اور ان کی تعلیمی اسکیموں پر مولینا مودودی نے اسی حیثیت سے ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔

"علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام جن امنگوں اور آرزوؤں کے ساتھ کیا گیا تھا ان کے لحاظ سے دیکھیں تو یہ تعلیمی مرکز بڑی تاریخی اہمیت کا حامل تھا ۔ اور اس کے داعیٔ اوّل سر سید احمد خاں کے حصے میں یہ کریڈٹ ضرور جاتا ہے کہ وہ مسلم قوم کے ایک خوفناک دورِ شکست میں فکری لیڈر بن کے اُبھرے اور ڈوبتی ہوئی قوم کو بچانے کے لیے جو کچھ بھی ان کی سمجھ میں آیا اس کے لیے جدو جہد شروع کر دی ۔

ان کی مساعی کی قیمت وقتی اور فوری بلکہ اضطراری تدبیر کے لحاظ سے جو ہے سو ہے، مگر ان کی اسکیم نے آگے چل کر کچھ اچھے نتائج کے ساتھ جو بہت سے بُرے نتائج پیدا کیے ان کا احساس خود سر سید کو بھی ہو گیا تھا، مگر اب جو دریا بہہ نکلا تھا اس کا رُخ بدلنا ان کے بس میں نہ تھا، اور نہ ان کے بعد مضطرب ہو کر اصلاحات کرنے والے کوئی مؤثر اقدام کر سکے ۔ خرابی خود اسکیم کے اندر ایسی تھی کہ اس کے سانچے میں ڈھل کر مسلم تہذیب کی علمبرداری کرنے والے اور مغربی تہذیب کے مفاسد کا مقابلہ کرنے والے دل و دماغ پیدا نہ ہو سکتے تھے ۔

وہ صرف ابتدائی دور تھا جس کے جذباتی ماحول میں چند قابلِ قدر نمایاں شخصیتیں اُبھریں ۔ اس کے بعد مسلم قوم پرستوں سے لے کر ملحدوں اور کمیونسٹوں تک کی کھیپیں تیار ہونے لگیں ۔ "مسلم بلا اسلام" یا "افرنگ زدہ مسلم" کا نیا کردار بھی اس "اسلامی" ادارے نے ڈھالنا شروع کر دیا ۔ اور یہ کردار مسلمانوں کے پیش رو طبقوں میں آج نمایاں دکھائی دیتا ہے اور اس کے کارناموں کے برگ و بار زندگی کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں ۔

مولانا کا مطالعۂ احوال یہ تھا کہ یہ سب کچھ اتفاقی حادثے کے طور پر نہیں ہو رہا بلکہ علی گڑھ کی تعلیمی اسکیم سے اسی کی توقع کی جا سکتی تھی ۔

علی گڑھ کے نظامِ تعلیم پر تبصرہ آیئے خود مولینا کے الفاظ کے آئینے میں حقیقت کا انعکاس دیکھیں :

"...... علی گڑھ سے جو تعلیمی تحریک اُٹھی تھی اس کا وقتی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس نئے دور کی

ضرورت کے لحاظ سے اپنی دنیا درست کرنے کے قابل ہو جائیں ...... اس وقت اس سے زیادہ کچھ کرنے کا شاید موقع نہ تھا...... اس وقت اتنی مہلت نہ تھی کہ غور و تفکر کے بعد کوئی ایسی محکم تعلیمی پالیسی متعین کی جاتی جو نقصانات سے پاک اور فوائد سے لبریز ہوتی ...... مسلمانوں کو اس طرزِ تعلیم کی طرف دھکیل دیا گیا جو ملک میں رائج ہو چکا تھا اور خطرات سے بچنے کے لیے کچھ تھوڑا سا عنصر اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی رکھ دیا گیا جس کو جدید تعلیم اور جدید تربیت کے ساتھ کوئی مناسبت نہ تھی ...... اس تحریک نے ہماری دُنیا تو ضرور بنا دی مگر جتنی دُنیا بنا لی اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا...... اس نے ہم میں کالے فرنگی پیدا کئے ...... اس نے ہماری قوم کے طبقۂ علیا اور طبقہ متوسط کو جو دراصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں، باطنی اور ظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادی تہذیب کے ہاتھ فروخت کر دیا، صرف اتنے معاوضے پر کہ چند عہدے، چند خطاب، چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں ...... سوال یہ ہے کہ کیا اب دائماً ہماری یہی تعلیمی پالیسی رہنی چاہیے۔ اگر یہی ہماری دائمی پالیسی ہے تو اس کے لیے علی گڑھ کی کوئی ضرورت اب باقی نہیں رہی، ہندوستان کے ہر بڑے مقام پر ایک علی گڑھ موجود ہے"[1]

اس تعلیمی پالیسی میں خرابی کی وجہ کیا ہے اس پر بھی مولینا کی رائے سُنیے:

"...... آپ اُن کو (یعنی نئی نسلوں کو) وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے۔ آپ ان کو تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانی کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصولِ عمران سے یکسر مختلف ہے۔ اس کے بعد کس بنا پر آپ یہ اُمید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہوگی، ان کی سیرت اسلامی سیرت ہوگی، ان کی زندگی اسلامی زندگی ہوگی؟ قدیم طرز پر قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس نئی تعلیم کے ساتھ بے جوڑ ہے ...... اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے فرنگی اسٹیمر میں پرانے بادبان محض نمائش کے لیے لگا دیئے جائیں مگر ان بادبانوں سے فرنگی اسٹیمر قیامت تک اسلامی سٹیمر نہ بنے گا۔"[2]

---

[1] تعلیمات، ص ۱۸، ۱۹۔ [2] تعلیمات، ص ۱۹، ۲۰۔

چند سطور اور ملاحظہ کیجیے:

"اِس وقت مسلم یونیورسٹی میں جو طریق تعلیم رائج ہے، وہ تعلیم جدید اور اسلامی تعلیم کی ایک ایسی آمیزش پر مشتمل ہے جس میں کوئی امتزاج اور کوئی ہم آہنگی نہیں ...... یہ دونوں عنصر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی مزاحمت کر کے طلبہ کے ذہن کو دو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے ہیں"[1]

"میری نظر میں مسلم یونیورسٹی کی دینی و دُنیاوی تعلیم بہ حیثیت مجموعی بالکل ایسی ہے کہ آپ ایک شخص کو از سر تا پا غیر مسلم بناتے ہیں، پھر اس کی بغل میں دینیات کی چند کتابوں کا ایک بستہ دے دیتے ہیں"۔

"...... اگر آپ ان حالات اور طرزِ تعلیم کو بعینہٖ جاری رکھیں...... تو اس کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ فرنگیت اور اسلامیت کی کشمکش زیادہ شدید ہو جائے گی اور ہر طالب علم کا دماغ ایک رزم گاہ بن جائے گا"[2]

ندوہ کا نظامِ تعلیم ۵ رجنوری ۱۹۴۱ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے اس تعلیمی ادارے کی اسکیم پر بھی ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ فرمایا:

"لوگ اس گمان میں ہیں کہ پُرانی تعلیم میں خرابی صرف اتنی ہے کہ نصاب بہت پُرانا ہو گیا ہے اور اس میں بعض علوم کا عنصر بعض علوم سے کم یا زیادہ ہے اور جدید زمانہ کے بعض علوم اس میں شامل نہیں ہیں۔ اس لیے اصلاح کی ساری بحث اس حد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے کہ کچھ کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے دوسری کتابوں کو داخل کر دیا جائے...... اور بہت زیادہ روشن خیالی پر جو لوگ اُتر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صاحب ہر مولوی کو میٹرک تک انگریزی پڑھا کر نکالو، تاکہ کم از کم تار پڑھنے اور لکھنے کے قابل تو ہو جائے...... اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ کامیاب قسم کے مولوی پیدا ہو جائیں جو کچھ جرمنی اور امریکہ کی باتیں بھی کرنے لگیں۔ اس ذرا سی اصلاح کا نتیجہ یہ کبھی نہیں نکل سکتا کہ دنیا کی امامت و قیادت کی باگیں علمائے اسلام

---

[1] تعلیمات، ص ۲۵۔ [2] تعلیمات، ص ۲۷، ۲۸۔

کے نافذ ہیں آجائیں"۔[۱]

مولانا کے نزدیک اس تعلیم کا متوقع ماحصل بس یہ ہے کہ:

"آپ گھٹیا قسم کے نہ سہی، بڑھیا قسم کے مقتدی بن جائیں۔ امامت بہر حال آپ کو نہیں مل سکتی۔ اِس وقت تک جتنی اصلاحی تجویزیں میری نظر سے گزری ہیں وہ سب کی سب بہتر مقتدی بنانے والی ہیں، امام بنانے والی کوئی تجویز ابھی تک سوچی نہیں گئی"۔[۲]

عام قسم کے اسلامی کالج انگریزی نظامِ تعلیم پر کام کرنے کے لیے جو اسلامی کالج قائم ہوتے رہے ان پر مولانا کی تنقید نسبتاً زیادہ سخت مگر درد بھرے انداز میں سامنے آتی ہے۔ اور اس تنقید میں ان کا ذوق انقلابیت خوب نمایاں ہے۔ ایک ایسے ہی کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد کا جو زلزلہ انگن خطبہ مولانا نے دیا اس کے چند جملے پیش ہیں:

"دراصل میں آپ کی اس مادرِ تعلیمی کو، اور مخصوص طور پر اسی کو نہیں بلکہ ایسی تمام مادرانِ تعلیم کو درس گاہ کے بجائے قتل گاہ سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک آپ فی الواقع یہاں قتل کیے جا رہے ہیں اور یہ ڈگریاں جو آپ کو ملنے والی ہیں یہ دراصل موت کے صداقت نامے (DEATH CERTIFICATES) ہیں جو قاتل کی طرف سے آپ کو اس وقت دیے جاتے ہیں جبکہ وہ اپنی حد تک اس بات کا اطمینان کر چکا ہے کہ اُس نے آپ کی گردن کا تسمہ تک لگا رہنے نہیں دیا ہے...... میری مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے بھائی بندوں کا قتل عام ہو چکنے کے بعد لاشوں کے ڈھیر میں یہ ڈھونڈتا پھر رہا ہو کہ کہاں کوئی سخت جان لبسمل ابھی سانس لے رہا ہے"۔[۳]

اس سلسلے میں آگے چل کر مولانا نے کہا کہ:

"ہر قوم کے بچے دراصل اس کے مستقبل کا محضر ہوتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے یہ محضر ایک سادہ لوح کی شکل میں آتا ہے اور قوم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خود اس پر اپنے مستقبل کا فیصلہ لکھے۔ ہم وہ دیوالیہ قوم ہیں جو اس محضر پر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود لکھنے کے بجائے اسے

---

[۱] تعلیمات ص ۶۶-۶۷ [۲] تعلیمات ص ۷۳

[۳] تعلیمات ص ۵۳-۵۴-

دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں کہ وہ اس پر جو چاہیں ثبت کر دیں، خواہ تمہاری اپنی موت ہی کا فتویٰ کیوں نہ ہو۔"[1]

اس نظام تعلیم کا یہ مایوس کن پہلو ہے کہ وہ کوئی مقصد طلبہ کو نہیں دیتا۔ اس کی طرف مولینا نے خصوصی توجہ دی ہے:

"مجھے بکثرت ایسے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے جو اعلےٰ تعلیم پا رہے ہیں، یا تازہ تازہ فارغ ہوئے ہیں ...... مگر میری مایوسی کی انتہا نہیں رہتی جب میں دیکھتا ہوں کہ مشکل سے ہزاروں میں سے کوئی ایسا ملتا ہے جو اپنے سامنے زندگی کا کوئی مقصد رکھتا ہو ...... اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگتا ہوں کہ اس نظام تعلیم کو کس نام سے یاد کروں جو پندرہ بیس سال کی مسلسل دماغی تربیت کے بعد بھی انسان کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کا کوئی مصرف اور اپنی کوششوں کا کوئی مقصود متعین کر سکے ...... یہ انسانیت کو بنانے والی تعلیم ہے یا اس کو قتل کرنے والی؟"[2]

اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے:

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں ملت اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو اس ملت کی پیشوائی کے لیے نہیں بلکہ غارت گری کے لیے تیار کرتا ہے"[3]

مثبت دعوت مولینا مودودی نے ایک صحیح اسلامی نظام تعلیم کے سلسلے میں متعدد اہم چیزیں تحریر کی ہیں، ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ یہاں اجمال سے ان کا مرکزی نقطۂ نظر عرض کیا جاتا ہے۔

"اگر فی الحقیقت ہم ایک اسلامی نظام تعلیم قائم کرنا چاہتے ہیں تو محض مرمتیں اور داغ دوزیاں کرنے سے کام نہیں چل سکتا بلکہ اس کے لیے ایک انقلابی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت اب یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ وہ دونوں نظام تعلیم ختم کر دیے جائیں جو اب تک ہمارے

(باقی بر صفحہ ۴۸)

[1] تعلیمات ص ۵۸ -

[2] تعلیمات ص ۵۹ - ۶۰ -

[3] تعلیمات ص ۶۲ -